مجید امجد ۔۔۔۔ ایک عظیم شاعر فطرت

ملک غلام حسین راشد

ABSTRACT:

Majeed Amjd possesses a distinguished rank among the modern Urdu poets. He has set new trends for the contemporary Urdu verse. He has unbounding love for the world of Nature---flowers, trees, greenery, brids, crops, cascades and lakes. A bulky portion of his versification deals with the beauties of nature, scattered around us in day to day life. He has observed the minute details of plant, bird and animal life in his suburbs with a profound keenness and penned it down with utter sincerity and affection. He is the Wordsworth of Urdu poetry as ninety-five percent of his works present/unfold the various facets and beauties of Nature.

The article in hand seeks to study the love and esteem of Majeed Amjad for the world of Nature in his poetry.

مجید امجد کا شمار عہد جدید کے عظیم اور صف اول کے نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھائی دہائی کے بعد اگر کسی شاعر نے حقیقی معنوں میں شاعری میں خیال اجالنے کا کام کیا ہے تو وہ بلاشبہ مجید امجد ہیں۔ ان کی نظموں کا ایک ایک مصرع ثابت کرتا ہے کہ اس میں سوچ کی آنچ موجود ہے۔ انھوں نے زندگی کے تجربات، مشاہدات اور علمی اکتسابات سے بھر پور مدد لیتے ہوئے اپنی نظموں میں ایک ایسے جاوداں منظر نامے کی تشکیل و تزیئن کی ہے جس میں انسانی ہستی اپنی تمام تر کوتاہیوں، کمیوں، ناکامیوں اور کامرانیوں سمیت منعکس ہے۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ مجید امجد نے نظم کے ایوان کی سلیں تراشتے وقت فطرت اور اپنے لینڈ اسکیپ کو رو برو رکھا۔ فطرت کی یہ بوقلمونی ان کی نظموں کے تارو پود کے اندر یوں گندھی ہے کہ اس کا مسکراتا چہرہ ان کے ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعے کے اندر دکھائی اور سجھائی دیتا ہے اور قاری ایک مسرت زا احساس میں شرابور ہو جاتا ہے ۔ مجید امجد کی

خالصتاً فطرت کی محبت پر مبنی نظمیں ایک طرف، ان کی تقریباً تمام شاعری خواہ وہ کسی اعلیٰ و ارفع فکر، فلسفہ یا نظریہ کو پیش کر رہی ہے، یا تو اپنی فطرت پر مبنی امیجری کی بنا پر، یا پھر فطرت سے مزین پس منظر یا پیش منظر کی وجہ سے ہمیں احساس دلاتی ہے کہ مجید امجد کی فطرت سے کس قدر گہری وابستگی ہے۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

> ''چوں کہ مجید امجد کے سارے کلام کے پچانوے فی صد میں فطرت کے رنگوں اور روشنیوں کے عکس ہیں، اس لیے بہت سی مثالیں دی گئی ہیں۔ مجید امجد کے کلام کی اس اہم خوبی کا ذکر ضروری ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جس کی وجہ سے وہ مستقبل میں بھی ایک زندہ شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔''(۱)

پروفیسر ڈاکٹر رغبت شمیم نے مجید امجد اور فطرت کے درمیان تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "Nature and cosmos are motifs of Majeed Amjad's poetry. He is directly attached with the local and rural life. His poetry is full of natural panorama, scenery and landscape. Just like Wordsworth, Majeed Amjad is a poet of Nature in Urdu Literature. He was against urbanization at the cost of cutting of forests".(2)

پروفیسر ڈاکٹر رغبت شمیم کے درج بالا الفاظ اس حقیقت کی برملا عکاسی کرتے ہیں کہ مجید امجد کا دل فطرت اور اپنی مٹی کی محبت سے شرابور ہے۔ اپنی نظمیہ شاعری میں نہ صرف وہ فطرت کا جا بجا ذکر کرتے ہیں اور اس سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اس میں بگاڑ کی کوئی بھی کوشش انھیں افسردہ اور سوگوار بنا دیتی ہے۔

مجید امجد کو گاؤں سے ایک خاص نسبت ہے۔ ان کی اپنی پرورش جھنگ جیسے نیم دیہاتی قصبہ نما شہر میں ہوئی جو شہر سے زیادہ دیہاتی رہن سہن اور لینڈ اسکیپ کے زیادہ قریب ہے۔ گاؤں کی مٹی اور کشادہ ماحول انھیں حد درجہ سکون دیتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فطرت کا اصل نظارہ گاؤں میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ دراصل گاؤں کی فضا ہر طرح کی کثافت اور آلودگی سے پاک ہوتی ہے اور یہاں کی سادہ زندگی میں تضادات اور انتشار بھی نسبتاً کم ہوتے ہیں۔ سیدھے سادھے لوگ فطرت کی آغوش میں پر سکون زندگی گزارتے ہیں۔ فطرت کے حسین مظاہرات انھیں دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ ان کے شب و روز گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں اور چھتناروں تلے نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ گزرتے ہیں۔ مجید امجد کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ شہر کی زندگی میں تضادات اور گہما گہمی زیادہ ہوتی ہے جو ذہن کو سکون آشنا نہیں ہونے دیتی۔ ہر وقت انسان عجیب و غریب کیفیات سے دو چار ہوتا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ شہر کی کثافت نے نہ صرف سماجی ماحول اور زندگی کو زہریلا بنا دیا ہے بلکہ فطرت کے حسین چہرے کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ مجید امجد اس ہولناکی سے خوفزدہ ہیں اور اس بگڑتی فضا اور ماحول کو دیکھ کر افسردہ ہو جاتے ہیں۔ انھیں بے طرح آغوش فطرت میں آباد گاؤں کی یاد آتی ہے جو ابھی تہذیب نو کی دستبرد سے محفوظ ہے:

یہ تنگ و تار جھونپڑیاں گھاس پھوس کی
اب تک جنھیں ہوا نہ تمدن کی چھو سکی
ان جھونپڑوں سے دور اس پار کھیت کے
یہ جھاڑیوں کے جھنڈ یہ انبار ریت کے
یہ دوپہر کو کیکروں کی چھاؤں کے تلے
گرمی سے ہانپتی ہوئی بھینسوں کے سلسلے
برفاب کے دفینے اگلتا ہوا کنواں
یہ گھنگروؤں کی تال یہ چلتا ہوا کنواں
یہ کھیت، یہ درخت، یہ شاداب گردو پیش
سیلاب رنگ و بو سے یہ سیراب گردو پیش
یہ نزہتِ مظاہرِ قدرت کی جلوہ گہ
ہاں ہاں یہ حسنِ شاہدِ فطرت کی جلوہ گہ
دنیا میں جس کو کہتے ہیں گاؤں یہی تو ہے
طوبیٰ کی شاخِ سبز کی چھاؤں یہی تو ہے (۳)

مجید امجد کو اپنی دوست، فطرت اور اس کے مظاہر و اشیا سے وفاداری اور ہمدردی ہے۔ جنگل فطرت کی قدیمی، اصلی، خالص اور اساطیری دنیا ہے۔ اس دنیا کا خالص پن اور آزادی اس لیے باقی ہے کہ اسے انسان کے ہاتھ نے نہیں چھوا۔ انسان کا ہاتھ مجید امجد کے لیے طاقت و ہوس کا استعارہ ہے۔ یہ ہاتھ فطرت پر تصرف کرتا ہے تو اس کے خالص پن کو آلودہ کرتا ہے اور اس کی آزادی میں مخل اور دخیل ہوتا ہے:

تم کتنے خوش نصیب ہو آزاد جنگلو!
اب تک تمھیں چھوا نہیں انساں کے ہات نے
اب تک تمھاری صبح کو دھندلا نہیں کیا
تہذیب کے نظام کی تاریک رات نے
اچھے ہو تم کہ تم کو پریشاں نہیں کیا
انسانیت کے دل کی کسی وار دات نے
ان وسعتوں میں کُلبہ و ایواں کوئی نہیں
ان کنکروں میں بندہ و سلطاں کوئی نہیں (۴)

مجید امجد فطرت کو ایک زندہ، حقیقی وجود سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر فطرت سے زندہ، حقیقی رشتے کے آرزو مند ہیں۔ 'طاقت و ہوس' کا ہاتھ فطرت پر تصرف سے جس تہذیب کی تشکیل کرتا ہے، اس میں بندہ و سلطاں اور کلبہ و ایواں کی

تفریق موجود ہوتی ہے۔ مجید امجد ایک روایتی رومانوی شاعر کی طرح انسان کی فطرت میں مداخلت کو ناپسند کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا نظم میں جنگل کا کم و بیش وہی تصور ظاہر ہوا ہے جسے رومانوی شعرا نے ایک مثالی و آدرشی دنیا یا جنت کے مماثل خیال کیا اور شہری تہذیب سے بیزار ہو کر، جس میں پناہ ڈھونڈنے کی تمنا کی۔ اقبال کی نظم ''ایک آرزو'' اس کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں جا بجا ایسی نظمیں بکھری پڑی ہیں جن میں نہ صرف فطرت کے ساتھ ان کے والہانہ لگاؤ کا پتا چلتا ہے بلکہ زندگی کو سمجھنے، اس کے دروں خانہ حقائق کی تلاش کرنے اور زندگی کی دھوپ چھاؤں کا ادراک کرنے میں یہ نظمیں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد خاں:

> ''مجید امجد کی نظموں میں واقعاتی سطح محض دستاویزیت تک محدود نہیں، شاعر کی سوچ اس میں گھمبیرتا پیدا کر دیتی ہے، یہی کیفیت فطرت کے مناظر کی بھی ہے۔ فطرت سے مجید امجد کی وابستگی رومانی سطح (تم کتنے خوش نصیب ہو آزاد جنگلو / تم کو ابھی چھوا نہیں انساں کے ہات نے) سے چلتی ہوئی ''توسیع شہر'' جیسی با کمال نظم میں درختوں کے نیلام اور درختوں کے قتل سے گم ہونے والی زندگی کی شادابیوں کا عظیم نوحہ بن جاتی ہے''۔(۵)

نظم ''توسیع شہر'' فطرت کے ساتھ مجید امجد کی بے پناہ محبت کا اظہار یہ ہے۔ جنگلات ہمارا فطری سرمایہ ہیں جو توسیع شہر کے لیے تیزی سے کاٹے جا رہے ہیں۔ جنگلات ہمارے ایکو سسٹم کا توازن برقرار رکھنے کے لیے از حد ضروری ہیں۔ انھیں دھرتی کا زیور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جنگلات کا تحفظ ہماری زندگی میں نہایت اہمیت رکھتا ہے جس کے لیے ہر فرد ذمہ دار ہے کہ وہ درختوں کو کٹنے اور ان کی خرید و فروخت کو روکنے کی کوشش کرے۔ جنگلات جو ہماری تہذیب و ثقافت کا بھی حصہ ہیں، حریص سرمایہ دار طبقہ کے لیے تر نوالہ بنے ہوئے ہیں۔سیم و زر کے پجاری ان کا بیدردی سے قتلِ عام کیے جا رہے ہیں۔ مجید امجد کو اپنے ماحول اور اپنے ماحول کی چیزوں سے بڑی ہمدردی ہے۔ درختوں کا کٹنا ایک طرف تو ''گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے چھتناروں'' کا نوحہ ہے تو دوسری طرف تیزی سے بڑھتے اس نظام کی طرف اشارہ ہے جو ہر قسم کی جمالیاتی اقدار سے بے بہرہ ہے۔ ڈاکٹر فخر الحق نوری کے بقول:

> ''''توسیع شہر'' متمدن زندگی کے پیدا کردہ مذکورہ منفی رویے پر اظہار تاسف اور اس کے خلاف احتجاج سے عبارت ایک منفرد نظم ہے۔ اس میں بے رحم مادہ پرستوں کے ہاتھوں کٹنے والے درختوں کا نوحہ بھی ہے، ایسا کرنے والوں پر طنز بھی اور اولادِ آدم کو جھنجھوڑنے کی کاوش بھی۔''(۶)

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے، ہرے بھرے اشجار

اور آخر میں کہتے ہیں:

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف ایک میری سوچ، لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل (۷)

درخت کاٹے جا چکے ہیں اور بیس ہزار کے عوض انھیں فروخت کر دیا گیا ہے۔ شاعر اکیلا اس گاتی ہوئی نہر کے کنارے پر کھڑا سوچ رہا ہے کہ انسان کتنا ظالم ہے کہ اس نے اتنی بیدردی کے ساتھ فطرت کے اس حسن کو تہ تیغ کیا ہے۔ اسے یہ گاتی ہوئی نہر ماتم کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور میدان ایک قتل گاہ لگتا ہے اور اس مقتل میں صرف ایک شاعر ہے جس کے دردمند دل میں غم کی آگ دہک رہی ہے۔ اسے مقتول درختوں کی ''لاشیں'' سہی دھوپ کا زرد کفن پہنے دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ نظم اس گہرے شعور کی ایک دلگداز تصویر ہے کہ انسانوں پر ہونے والے مظالم پر تڑپنے والا شاعر اشجار پر ہونے پر ظلم وستم پر بھی خاموش نہیں رہ سکا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''گویا مجید امجد نے احساسی سطح پر خود کو شجر سے اس طور ہم آہنگ کر لیا ہے کہ شجر کے کٹنے پر اسے خود اپنے اعضا کے کٹنے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ہم آہنگی کسی اضطراری جذبے کی پیداوار نظر نہیں آتی بلکہ سائیکی کے اس دیار سے منعکس ہوتی لگتی ہے جہاں آج بھی درخت سے انسان کا انسلاک لہو کے سمبندھ کا درجہ رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شیمن کی طرح مجید امجد پر بھی ایک لمحی خود فراموشی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ وہ درخت کے قبیلے کا ہی ایک رکن ہے۔''(۸)

''توسیع شہر'' درختوں کا نوحہ ہے جو لوئر باری دوآب کے کنارے درخت دشمن مافیا کی مہربانیوں کے سبب کٹ جانے والے درختوں کے سوگ میں معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن یہاں پر درختوں کا کٹ جانا محض چند درختوں کا کٹنا نہیں بلکہ ایک پوری روایت کا کٹ جانا ہے جو کہ گمنام محبت کی کوئی روایت بھی ہوسکتی ہے۔ ایسے ہی ایک دوسری نظم ''دور کے پیڑ'' میں وہ درختوں کو زرد کفن میں لپٹی لاشوں سے تشبیہ دیتے ہیں:

خستہ دل پیڑوں کی اک سونی قطار
خشک چٹانیں کھڑ کھڑاتی ٹہنیاں
بے کفن لاشوں کی طرح آویختہ (۹)

پروفیسر محمد افتخار شفیع رقم طراز ہیں:

> ''تنہائی اور درختوں سے محبت دراصل فطرت سے محبت ہے۔ فیض احمد فیض نے اگر سیاست کو محبوبہ کے طور پر پیش کیا تو یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ یہ بات مجید امجد کے ہاں فطرت کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔ ان چیزوں کے مشاہدے کے بعد مجید امجد کا قاری تنہائی، درخت اور مجید امجد کو ایک مثلث کے تین زاویے سمجھنے لگتا ہے۔''(۱۰)

مجید امجد کی فطرت نگاری نے ان کے فکر کے ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل طے کیے۔ ابتدا میں مجید امجد نے اپنے دور

کے رومانوی طرز فطرت نگاری کی نمایندگی کی، لیکن دیگر نو عمر شعرا کے مقابلے میں ان کا یہ انداز بھی ابتدا ہی سے پختگی لیے ہوئے ہے۔ درج ذیل نظم میں وہ ستاروں، موجوں اور جھونکے سے مخاطب ہو کر غمِ عشق بیان کر رہے ہیں:

بتا بھی مجھ کو ارے ہانپتے ہوئے جھونکے
ارے او سینۂ فطرت کی آہِ آوارہ!
تری نظر نے بھی دیکھا کبھی وہ نظارہ
کہ لے کے اپنے جلو میں ہجوم اشکوں کے
کسی کی یاد جب ایوانِ دل پہ چھا جائے
تو اک خرابِ محبت کو نیند آجائے (۱۱)

کہتے ہیں کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ مجید امجد سا جمال پرست انسان تو رنگ و نور کے جلوے جا بجا دیکھتا ہے اور ہر نظر نواز نظارہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون بن جاتا ہے۔ فطرت کی دنیا قدم قدم پر اس کے پاؤں روکتی ہے اور اس کی چشمِ بینا کو حسن و رعنائی سے معمور کر دیتی ہے:

شیشم کی اک شاخ پر
کھیلے سکھ کے کھیل
کھلتی، بڑھتی، رینگتی
چمپا کی اک بیل
جس کی نازک ڈور سے
جھم جھم جھم لہرائیں
لچھے پھولوں کے ! اچھے اچھے پھولوں کے
لچھے پھولوں کے (۱۲)

فطرت کے مختلف مظاہر دیکھنے کے ہم اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کے حسن سے بے پروا اور بے خبر گزر جاتے ہیں۔ ہمارے حواس اس قدر کُند ہوگئے ہیں کہ وسیع میدان، ٹیلے اور پہاڑ، لہلہاتی فصلیں، پکے ہوئے پھل، خوشبو لٹاتے پھول، چہچہاتے پنچھی، شگوفوں پہ رقصاں تتلیاں، رات کو جھاڑیوں میں ٹمٹماتے جگنو، سر پر پلکیں جھپکتے ستارے، کھلی ہوئی چاندنی، بادل، بارش، برف باری، نیلگوں جھیلیں، جھرنے اور آبشاریں ہماری بہت کم توجہ منعطف کر پاتے ہیں:

شیتل شیتل دھوپ میں بہتے سایوں کا یہ کھیل
اک ڈالی کی ڈولتی چھایا، لاکھ امٹ ارمان
تھر تھر کانپیں سوکھے پتے، جھم جھم جھمکیں دھیان
یہی بہت ہے پت جھڑ کی اس سہمی رت کا دان (۱۳)

صبح تا شام پھیلے ہوئے مصروفیتوں کے مشینی سلسلے نے انسان کو کچھ ایسا جکڑا ہوا ہے کہ خود اس پر مشین ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ مشینی زندگی نے ہمیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ ہم اپنی روز مرہ الجھنوں سے نکل کر ان مظاہر پر نظر ڈال سکیں۔ ان میں جو تحیر ہے، اس سے اپنے حواس کو کچھ دیر کے لیے زندہ کر لیں۔ مظاہر فطرت کو ''بھکاری'' بن کر حضرت انسان سے ایک نظر کی بھیک مانگنا پڑتی ہے:

تیز قدموں کی آہٹوں سے بھری
رہگذر کے دو رویہ سبزہ و کشت
چار سو ہنستی رنگتوں کے بہشت
صد خیابانِ گل کہ جن کی طرف
دیکھتا ہی نہیں کوئی راہی!
سرخ پھولوں سے اک لدی ٹہنی
آن کر بچھ گئی ہے رستے پر
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے
''میں کہاں روز روز آتی ہوں
ہے میرے کوچ کی گھڑی نزدیک
جانے والو ، بس ایک نگاہ کی بھیک'' (۱۴)

اپنے کلام میں بہت سے مقامات پر مجید امجد لوگوں کے اس طرز عمل کی نشان دہی کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کرتے ہیں جس کے نتیجے میں روز مرہ پیش آنے والے واقعات اور روٹین کا شکار اشیا و مظاہر رفتہ رفتہ اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔ وہ اس غفلت اور بے توجہی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو انسان کی عدیم الفرصتی کے نتیجہ میں جنم لیتی ہے۔ جدید انسان کی خود ساختہ مصروفیات اسے اس جہاں کے اندر موجود دیگر جہانوں سے غافل و بے پروا رکھتی ہیں اور وہ بے مقصد زندگی جی کر بے مقصد موت سے ہم آغوش ہو کر قصۂ پارینہ بن جاتا ہے۔ یہی کم توجہی اور کم التفاتی مجید امجد کی ذات کا المیہ بن جاتی ہے۔ لیکن وہ تمام اشیا و واقعات جو بظاہر انتہائی معمولی اور نا قابل توجہ ہیں اس عظیم شاعر کی خرد بیں نگاہوں سے نہ چوکتے ہوئے اس کے ذہن و شعور میں جگہ پاتے ہیں:

دیکھ اے دل کیا سماں ہے کیا بہاریں شام ہے
وقت کی جھولی میں جتنے پھول ہیں انمول ہیں
نہر کی پٹڑی کے دو رویہ مسلسل دور تک
برگدوں پر پنچھیوں کے غُل مچاتے غول ہیں (۱۵)

فکری اور موضوعاتی سطح پر مجید امجد کی شاعری فطرت کی رنگا رنگی کی آئینہ دار ہے جس پر خواجہ محمد زکریا کا استدلال

قابلِ توجہ ہے:

''مجید امجد کی شاعری میں فطرت کی گونا گوں اور انسانی روابط کے گہرے مشاہدے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اندھیرے کی امیجری چھوڑ کر اجالوں کی دنیا میں لوٹ آتا ہے۔ صبح کا تارا، سورج کی سنہری کرنیں، کھیتوں، چرواہے کی بنسی کی تان، مندروں کی گھنٹیاں اور بھجن، بیری اور تلسی کی خوشبوئیں، ہواؤں کے جھونکے، گنجان جنگل، پہاڑیاں اور تیرائیاں ،غرض انواع و اقسام کے مظاہر فطرت کے سلسلے اس کے حواس کے رو برو بے نقاب ہونے لگتے ہیں۔ مجید امجد کی شاعری کا یہ حصہ حد درجہ جاذبِ نظر اور رنگا رنگ ہے۔''(۱۶)

فطرت اور اس کے مناظر ہماری اردو شاعری میں ابتدا ہی سے تجسیم ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔کیوں کہ اردو شاعری کا تعلق زیادہ تر دربارِ شاہی سے رہا ہے، اس لیے سب سے پہلے قصائد میں ان کا رواج ہوا۔ قصائد اپنی ہیئت کے لحاظ سے فطرت کی تصویر کشی کے متقاضی ہیں۔ بقول پروفیسر جابر علی سید:

''فطرت سے ہمارے شعرا کی وابستگی کا اظہار قصیدے کی تشبیب سے ہوا۔ قصیدہ خواہ نعتیہ ہو یا منقبتیہ، اس کی تشبیب بہاریہ ہوسکتی ہے۔ گریز کا حسن اس سلسلے کو اس طریق پر مدح میں ضم کر دیتا ہے کہ شاعر کی ذہانت اور تخیل کا قائل ہونا پڑتا ہے۔''(۱۷)

قصیدے کے بعد مثنوی اور مثنوی کے بعد مرثیے میں یہ رجحان شدت کے ساتھ موجود ہے۔ میر خلیق اور میرزا دبیر کے ہاں بھی اگر چہ اس طرح کے نمونے کثرت سے ہیں مگر میر انیس نے اس حوالے سے کمال کر دکھایا۔ بقول رام بابو سکسینہ:

''انھیں مناظرِ فطرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا۔ اس قسم کے بیانات مرثیے میں غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت ہی ہوتے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز ہیں جو مرثیے سے بالکل الگ کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پورا مرثیہ ایسا مرقع ہوتا ہے جس میں صد ہا خوبصورت، خوبصورت مکمل تصویریں چسپاں ہیں۔''(۱۸)

میر انیس کے مرثیے سے پہلے نظیر اکبر آبادی اور اس کے بعد حالی، اسماعیل میرٹھی، آزاد، جوش، حفیظ جالندھری، احسان دانش اور پھر اقبال کی نظموں میں مناظر فطرت کی تصویر کشی اور فطرت کے حسن کی پیکر تراشی کے نمونے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے مناظر کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات کی پیکر تراشی کا کام اس مصورانہ حسن سے کیا کہ خود فطرت کو اپنی تصویر پر رشک آنے لگا۔ اقبال کے بعد مجید امجد ایک ایسا معتبر اور وقیع نام ہے جو حسن فطرت کو اپنی شاعری میں اس طرح سموتا ہے کہ ان کی نظم اس نوع کی شاعری کا ایک خصوصی حوالہ بن چکی ہے۔ بقول ڈاکٹر نثار ترابی:

''مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اقبال کے بعد اس نوع کی پیکر تراشی صرف اور صرف مجید امجد کے ہاں ملتی ہے۔ مجید امجد اپنے ماحول اور کائناتی نظام کے ہر عنصر کا گہری نظر سے مشاہدہ

کرتے ہوئے اپنے مشاہدے کے اثرات سے فکر کے ہزاروں در کھولتے چلے جاتے ہیں۔''(۱۹)

مجید امجد کی پیکر تراشی کا ایک شوخ نمونہ ملاحظہ ہو:

ندی کے لرزتے ہوئے پانیوں پر
تھرکتی ہوئی شوخ کرنوں نے چنگاریاں گھول دی ہیں
تھکی دھوپ نے لہروں کی پھیلی ہوئی ننگی باہوں پہ اپنی لپٹیں کھول دی ہیں
یہ جوئے رواں ہے
کہ بہتے ہوئے پھول ہیں جن کی خوشبوئیں گیتوں کی سسکاریاں ہیں (۲۰)

فطرت ان کی نظموں میں اپنی تمام تر رعنائیوں، خوبصورتیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ زندگی کے وہ پہلو جنھیں ہم غیر اہم سمجھتے ہوئے لائق توجہ نہیں گردانتے، انھیں بھی مجید امجد اپنی اصل شکل میں واضح اور نمایاں کر کے دکھاتے ہیں۔ لفظ تصویریں بن کر سامنے آتے ہیں تو تحریر پر تصویر کا گمان ہوتا ہے۔ مظاہر فطرت کے ساتھ مجید امجد کی بے ساختہ وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ ہنگامہ پرور شہروں سے دور کھلے آسمان کی چھتری تلے گزارا۔ انھیں موجوداتِ عالم کا غیر معمولی شغف تھا اور اس سے ان کی شاعری کو ارضی بنیا دملی۔ بظاہر مجید امجد کی شاعری پر اداسی کی ایک دبیز تہ جمی ہوئی ہے لیکن جونہی مادے کا بوجھ ہٹ جاتا ہے تو وہ اپنا رشتہ ماورا سے قائم کر لیتے ہیں اور وہ کائنات کے حسن میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ مجید امجد معمولی سے مشاہدے کو غیر معمولی بنانے اور بجھی ہوئی چنگاریوں سے روشنی ڈھونڈ لینے والے عہد آفریں شاعر تھے۔''(۲۱)

فطرت کے مناظر کو لفظی پیکروں میں ڈھالتے ہوئے بھی مجید امجد پیش منظر اور پس منظر دونوں کیفیات کو سامنے رکھتے ہیں۔ وہ ان دیکھے ماحول اور مناظر کی ادبی تصویریں ہی پیش نہیں کرتے بلکہ مشاہدے اور گہرے مشاہدے میں آنے والے مناظر کو بھی اپنی البم کا حصہ بناتے ہیں۔ پیکر تراشی کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ابھی ابھی سبز کھیتوں پر
جو دور تک مست آرزوؤں کی موج بن کر لہک رہی ہیں
سیاہ بادل جھکے ہوئے تھے
اور اب حسیں دھوپ میں نہاتی فضائیں زلفیں جھٹک رہی ہیں
طویل پٹڑی کے ساتھ رقصاں
مہیب پیڑوں کے گونجتے جھنڈ، دراز سایوں سے بجتی راہیں
کہ جن کی موہوم سرحدوں پر

نکل کے گاڑی کی کھڑکیوں سے تری نگاہیں، مری نگاہیں
الگ الگ آ کے تھم گئی ہیں (۲۲)

اقبال کی ابتدائی شاعری میں انسانوں کے سماجی میل جول اور فطرت سے انسانوں کے متعلق خیالات و جذبات کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ان کے ہاں ''بانگ درا'' کے دور اول کی شاعری میں بھی فطرت نگاری نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اقبال جا بجا عناصرِ فطرت سے ہم کلام ہو کر ان سے استفسارات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی عناصرِ فطرت سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے خیالات و افکار پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ 'ہمالہ'، 'شمع و پروانہ'، 'گل پژمردہ' اور 'آفتاب' وغیرہ میں خطابیہ لہجہ نمایاں ہے مثلاً

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا (۲۳)

ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال کی فطرت نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''اقبال کے فلسفۂ خودی میں فطرت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اقبال نے ابتدا میں جو طرزِ عمل فطرت کے بارے میں اپنایا ہے، وہ رومانی احساس میں ہے۔ وہ مظاہر فطرت کو مخاطب کر کے کرب و اضطراب کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنے اور فطرت کے درمیان ہم آہنگی چاہتے ہیں۔''(۲۴)

مجید امجد نے اقبال کی فطرت سے محبت کا گہرا اثر لیا۔ ان کی پچانوے فی صد نظموں میں فطرت کسی نہ کسی صورت میں قاری کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ ان کا دل اور فکر فطرت کی محبت سے سرشار ہے جس کا شعری اظہار ان کی نظموں کا بہترین خام مواد ہے۔ اقبال کی طرح فطرت سے مکالمہ اور گفتگو مجید امجد کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ جا بجا مناظر فطرت کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں:

او مسکراتے تارو! او کھلکھلاتے پھولو!
کوئی علاج میری آشفتہ خاطری کا (۲۵)

نظم ''رکھیا اکھیاں'' میں مظاہر فطرت سے کچھ یوں ہم کلام ہوتے ہیں:

جھکی جھکی گھنگور گھٹائیں
ساون، پھوار، ہوا، ہریاول
رس کی نیند میں جاگتی دنیا
کچھ تو بولو۔۔۔۔۔۔تم کیوں ہنس دیں
پتھر کے چہرے پہ جڑی اکھیو (۲۶)

ہری بھری فصلوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ہری بھری فصلو!
جگ جگ جیو پھلو

ہم تو ہیں بس دو گھڑیوں کو اس جگ میں مہمان
تم سے ہے اس دیس کی شوبھا، اس دھرتی کا مان
دیس بھی ایسادیس کہ جس کے سینے کے ارمان
آنے والی مست رتوں کے ہونٹوں پر مسکان
جھلکتے ڈنٹھل، پکتے بالے ، دھوپ رچے کھلیان
ایک ایک گھروندا خوشیوں سے بھر پور جہان
شہر شہر اور بستی بستی جیون سنگ بسو
دامن دامن، پلّو پلّو، جھولی جھولی، ہنسو
چندن روپ سجو
ہری بھری فصلو
جگ جگ جیو، پھلو! (۲۷)

گھٹا سے یوں گویا ہوتے ہیں:

گھٹا! نہ رو! مرے دردوں پہ اشکبار نہ ہو
مجھ ایسے سوختہ ساماں کی غمگسار نہ ہو (۲۸)

پھول فطرت کا ایک انتہائی خوبصورت روپ ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں جا بجا پھولوں کلیوں کا ذکر ان کی فطرت سے بے پایاں محبت کا عکاس ہے۔ بیمار معاشروں میں پھولوں کا وجود صرف ان کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی خطرے اور خدشوں کا باعث بن جایا کرتا ہے۔ ان کا شاخوں پر جھولنا جرم اور خوشبو بکھیرنا گردن زدنی قرار پاتا ہے۔ مجید امجد اس صورتِ حال سے مفاہمت کرنا توہین سمجھتے ہیں۔ وہ حالات کے جبر کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے آنگن میں کھلے پھولوں کے شاخوں سے جدا ہونے کے منظر کو چشمِ تصور سے دیکھتے ہیں اور انھیں شاخ سے ٹوٹ کر اپنے خیالوں کے گلدان میں آجانے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی یہ دعوت صرف صورتِ حال سے سمجھوتے پر ہی نہیں بلکہ اچھے مستقبل کی امید پر استوار ہے۔ پھولوں سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوتے ہیں:

اب تو تمھارا ہونا اک خدشہ ہے
اب تو تمھارا ہونا۔۔۔۔۔۔۔سب کو موت ہے
شاخ سے ٹوٹ کر میرے خود آگاہ خیالوں کے گلدان میں اب آجاؤ (۲۹)

یہاں تک کی پیش کش بھی فطرت سے مجید امجد کی دوستی کے اظہار کے لیے کافی تھی لیکن ان کا مسئلہ فقط روشنی اور حسن سے اپنے تعلق کا اظہار نہیں ہے، انھیں تو کارگہ عالم میں عملِ خیر کے تسلسل سے دلچسپی ہے۔ خیر جو پھول، خوشبو اور

روشنی کے روپ میں ہے، معرض خطر میں ہے لیکن مجید امجد اس کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ وہ صحن میں کھلنے والے پھولوں سے مخاطب ہو کر انھیں تسلی دیتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر چہ آج تاریکی اپنے پنجے گاڑ چکی ہے جس کے نتیجے میں پھولوں کو ہجرت کرنا ہوگی، وہ انھیں اپنے باطن میں سمٹ آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ خارج میں ہر سمت تاریکیوں کی حکمرانی کے زمانے میں مجید امجد کا باطن وہ جائے پناہ ہے جو بارود کی بو سے پاک ہے۔ جہاں روشنی ہے، پھول کھلتے ہیں اور جہاں پھولوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے اور یہاں پہنچ کر نظم 21 دسمبر 1971ء اپنی تکمیل کرتی ہے:

۔۔۔۔۔۔۔۔اور یوں مت سہمو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کل پھر یہ ٹہنیاں پھوٹیں گی
کل پھر سے پھوٹیں گی سب ٹہنیاں
آتی صبحوں میں پھر ہم سب مل کے کھیلیں گے
اس پھلواڑی میں (۳۰)

مجید امجد مناظر و مظاہر فطرت سے سچی محبت رکھتے ہیں لیکن انھیں دکھ ہے کہ باقی لوگ اس مقدس اور پر وقار حسن سے جان بوجھ کر بے خبر اور انجان رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں سب کچھ دیکھ کر ان مسرت زا اور نشاط آگیں نظاروں سے لطف و انبساط کشید کرنے میں ناکام و نامراد رہتی ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں پھولوں کی مہک نے نہ صرف شاعر کو اور اس کے کلام کو مہکا دیا ہے بلکہ قاری کو بھی اپنا تمام وجود مہکا ہوا محسوس ہوتا ہے:

پھولوں کی خوشبو ہنستی آئی — میرے بسیرے کو مہکانے
میں خوشبو میں، خوشبو مجھ میں — اس کو میں جانوں، مجھ کو وہ جانے
مجھ سے چھوکر، مجھ میں بس کر — اس کی بہاریں، اس کے زمانے
لاکھوں پھولوں کی مہکاریں — رکھتے ہیں گلشن ویرانے
مجھ سے الگ ہیں مجھ سے جدا ہیں — میں بیگانہ، وہ بیگانے
دستِ خزاں نے، موجِ صبا نے — ان کو بکھیرا، ان کو اڑایا (۳۱)

مجید امجد کی فطرت نگاری کے حوالے سے خامہ فرسائی کرتے ہوئے بلراج کومل کہتے ہیں:

> ''مجید امجد ارضی زندگی کے قریب ہی سے اخذِ نور کرتے ہیں۔ وہ ہمارے شہروں، قصبوں اور دیہات سے روز و شب گزرتے ہیں۔ وہ گلیوں، بازاروں، گھروں، چھتوں، ممٹیوں، پہاڑوں، میدانوں اور ان کے درمیان سانس لیتے ہوئے انسانوں کو قریب سے دیکھتے ہیں اور ان کی دھڑکنیں سنتے ہیں اور ہری بھری فصلوں کے نغمہ ساز ہیں۔''(۳۲)

ابتدائی زمانہ سے لے کر انتہائی زمانۂ شاعری تک مجید امجد نے پھولوں، درختوں، پھلوں، پودوں، فصلوں کے حوالے سے نہایت عمدہ اشعار اور نظمیں تخلیق کیں جو فطرت سے ان کی بے پایاں محبت کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ پھولوں، پودوں، درختوں اور فصلوں کی کوکھ سے پھوٹتی ہوئی نظمیں وطن کی مٹی اور سوہنی دھرتی سے محبت کا اظہار یہ بھی ہیں۔ یہ

تعداد میں کافی زیادہ ہیں۔ ان نظموں کو محض فطرت پرستی سے متعلق نظمیں نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ تو مجید امجد کی روح کی پکار ہیں۔

صبح کی سیر مجید امجد کے معمولات میں سے ایک تھا۔ بالعموم سحر دم سیر کے دوران میں مجید امجد کی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی دوسرا شریکِ سفر نہ ہو۔ وہ رات کو جتنی بھی تاخیر سے سوئیں، صبح دم اٹھ کر سیر کے لیے نکل جاتے تھے۔ اس معمول نے انھیں بے شمار نظموں کا مواد فراہم کیا۔ جھنگ میں سحر دم سیر کے دوران میں نظر آنے والے ایک منظر اور اس منظر سے لپکتی ہوئی ایک مخصوص آواز اور پھر پانی کی روانی اور اس روانی سے ابھرتی ہوئی ایک مسحور کن موسیقی نے انھیں متاثر کیا تو ایک انتہائی خیال افروز نظم ''کنواں'' معرضِ تخلیق میں آئی جو زرعی فطرت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے:

کنواں چل رہا ہے! مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں، نہ فصلیں، نہ خرمن، نہ دانہ
نہ شاخوں کی باہیں، نہ پھولوں کے مکھڑے، نہ کلیوں کے ماتھے، نہ رت کی جوانی
گزرتا ہے کیاروں کے پیاسے کناروں کو یوں چیرتا، تیز، خوں رنگ پانی
کہ جس طرح زخموں کی دُکھتی تپکتی تہوں میں کسی نیشتر کی روانی

ادھر دھیری دھیری
کنوئیں کی نفیری
ہے چھیڑے چلی جا رہی اک ترانا
پر اسرار گانا (۳۳)

مجید امجد کی تخلیقی شخصیت میں درختوں، پتوں، فصلوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔ یوں تو انھیں ہر قسم کے پھول پسند تھے لیکن گلاب کے پھولوں سے انھیں خصوصی شغف تھا۔ ان کے گھر کے آنگن میں کلیوں اور گلابوں کے پودے تھے۔ اسٹیڈیم ہوٹل میں ان کے بیٹھنے کی ایک مخصوص جگہ تھی جہاں ہوٹل کے مالک صادق جوگی کے حکم کے مطابق اسٹاف صبح دم ہی گلاب کے تازہ پھولوں کا گلدستہ سجا دیتا تھا۔ مجید امجد دفتر جانے سے پہلے اسی ہوٹل میں آ کر ناشتا کیا کرتے تھے۔ مجید امجد کی شاعری میں پھولوں سے تعلق کئی ایک پیرایوں میں سامنے آیا ہے:

افق افق پہ زمانوں کی دھند سے ابھرے
طیور، نغمے، ندی، تتلیاں، گلاب کے پھول
کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے
عروسِ گل بہ قبائے جہاں، گلاب کے پھول
سلگتے جاتے ہیں، چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں، گلاب کے پھول (۳۴)

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''ایسا ہی شاعر فطرت سے گہرا رابطہ استوار رکھنے پر قادر ہوسکتا ہے جو حیات و کائنات کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں مجید امجد اردو شاعری میں نیچر سے پکی اور گہری اور بامقصد اور بامعنی دوستی کی ایک نہایت بلیغ مثال ہے اور اس کی دوستی کو صرف وہی اہل فن نبھا سکتے ہیں جو اپنے اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا کو یوں مربوط اور یک جان کر لیتے ہیں کہ جب باہر پھول کھلتا ہے تو مہک ان کے اندر تک پہنچ جاتی ہے اور جب ان کے اندر کسی خیال کی کلی چٹکتی ہے تو باہر گلزاروں کے رنگ جگمگا اٹھتے ہیں۔''(۳۵)

پھلواڑی میں پھول کھلے، مرجھائے
کون اب ان کی مٹی راکھ سے اپنی مانگ سجائے
آتے زمانے نئے پھول اور نئی بہاریں لائے (۳۶)

ان کی زندگی میں کئی موڑ آئے لیکن پھولوں سے ان کا تعلق تمام عمر قائم رہا۔ خاص کر گلابوں سے ان کا رشتہ بہت ہی گہرا تھا۔ انھوں نے گلاب کے پھولوں سے یوں محبت کی ہے کہ جیسے یہی ان کی زندگی ہو اور انھوں نے اس محبت کو صرف عشرتِ یک لحہ کا معاملہ نہیں بنایا۔ قیوم صبا اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''مجید امجد کی ذات کے اندر، بہت ہی اندر دور گلابوں کا ایک باغ ہے۔ اس آدمی کا گلابوں سے رشتہ اٹوٹ ہے اور اٹوٹ رہے گا۔''(۳۷)

جدید دور کے انسان کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ فطرت کے مختلف حسین و دلربا مظاہر اس کی گونا گوں مصروفیتوں کی بنا پر اس کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ حالاں کہ فطرت میں بے پناہ رنگا رنگی موجود ہے۔ اس بوقلمونی اور رنگا رنگی پر نگاہ کی جائے تو حیرت انگیز مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن مشینی دور کا انسان مشینوں کے درمیان رہ رہ کر خود ایک کل کا روپ دھار چکا ہے اور دنیائے فطرت سے دور، گریزاں اور بے پرواہو گیا ہے۔ اسی درد کا اظہار ولیم بلیک نے اپنی مشہور نظم Leisure میں یوں کیا ہے:

What is this life if full of care,
We have no time to stand and stare?
No time to stand beneath the boughs
And stare as long as sheep or cows. (38)

فطرت کے رنگا رنگ مظاہر مجید امجد کی نظموں میں سطر سطر جگمگا اٹھتے ہیں تو حیرتوں اور مسرتوں کے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں:

لے کر نیلم جڑے تھال میں، نیل کمل کے پھول
کس شُردھا سے کھڑا ہے ترے چرنوں کے نزدیک
ٹھہری ٹھہری، گہری جھیل کا شیتل شیتل جل

تِلّی، پیچاں، بیلڑیوں کے جھرمٹ کے اوجھل
جھیل کنارے، تو بیٹھی ہے، اپنے آپ میں گم
تیرے پاؤں تلے، پانی پر نیلوفر کے پھول
جن پر چھڑکنے کو آئی ہے البیلی رتوں کے روپ
تیتریوں کے پروں کی پیلی چادر اوڑھ کے دھوپ
نیلی جھیل، سجیلے پھول، البیلی رت اور تو
ایک تری یہ بھیجی ہوئی رنگیں تصویر اور میں (۳۹)

''صاحب کا فروٹ فارم'' بھی کمال کی ایک نظم ہے جس میں فطرت کی حسین جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں:

یہ دھوپ جس کا مہین آنچل
ہوا سے مس ہے۔۔۔
رتوں کا رس ہے!
تمام چاندی، جو نرم مٹی نے پھوٹتے بور کی چٹکتی چنبیلیوں میں انڈیل دی ہے
تمام سونا، جو پانیوں، ٹہنیوں، شگوفوں میں بہ کے ان زرد سنگتروں سے ابل پڑا ہے
تمام دھرتی کا دھن، جو بھیدوں کے بھیس میں دور دور تک سرد ڈالیوں پر بکھر گیا ہے
رتوں کا رس ہے۔۔۔۔۔۔۔رتوں کے رس کو
گداز کر لو
سبو میں بھر لو (۴۰)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

''مجید امجد کے ہاں مناظر فطرت کی یہ فراوانی اور ان کا انوکھا پن ہماری منظریہ شاعری میں ایک حیرت انگیز اضافہ ہے جس میں مناظر کی وسعت، رنگارنگی، تحرک، نئے زاویوں سے مشاہدہ، تمام حسیات کو بروئے کار لانا، آوازیں، رنگ اور انسانی زندگی سے ان کا ارتباط ہر لحاظ سے غیر معمولی ہے۔'' (۴۱)

ان تمام خوبیوں سے مزین مجید امجد کی شاعری فی الحقیقت منظریہ شاعری سے بہت آگے کی چیز ہے۔ فطرت مجید امجد کے ہاں محض فطرت نہیں اور مناظر محض مناظر نہیں بلکہ فطرت اور انسان اس شاعری میں ایک دوسرے کے ساتھ یوں مربوط اور ہم رشتہ ہو گئے ہیں کہ انھیں جدا جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ بسا اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ فطرت ان کی شاعری میں ایک زندہ وجود رکھتی ہے اور احساساتی سطح پر انسانوں کے سے محسوسات رکھتی ہے۔ اس طرح یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کا دل فطرت کی محبت سے شرابور ہے اور وہ اردو شاعری میں فطرت کے حوالے سے ایک نہایت وقیع اور معتبر حوالہ ہیں۔ انھیں اگر اردو کا ورڈز ورتھ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

حوالہ وحواشی:

(۱) ناہید قاسمی ، ڈاکٹر:(2002ء) جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(مقالہ PhD)، کراچی ،انجمن ترقی اردو پاکستان،ص526

(۲) رغبت شمیم ملک، ڈاکٹر:(2014ء اکتوبر ، نومبر)، ''مجید مجد۔۔۔فطرت اور ماحول کا شاعر''، ماہنامہ نمود حرف، مجید امجد صدی نمبر،ص14

(۳) مجید امجد:(2014ء) کلیات مجید امجد (مرتبہ:خواجہ محمد زکریا)،لاہور، الحمد پبلی کیشنز،ص188

(۴) ایضاً،ص72

(۵) سہیل احمد خاں، ڈاکٹر:(1987ء نومبر، دسمبر) ''مجید امجد کی نظم نگاری کی محسوساتی اور فکری جہتیں''، (مضمون) مشمولہ اوراق، لاہور،ص306

(۶) فخر الحق نوری، ڈاکٹر:(2000ء) توضیحات، لاہور، کلیہ علوم اسلامیہ وشرقیہ جامعہ پنجاب،ص 137

(۷) مجید امجد:(2014ء) کلیات مجید امجد (مرتبہ:خواجہ محمد زکریا)،لاہور، الحمد پبلی کیشنز،ص302

(۸) وزیر آغا، ڈاکٹر:(2011ء) ''مجید امجد کی شاعری میں شجر''، مشمولہ مجید امجد نئے تناظر میں(مرتب احتشام علی)، لاہور، بیکن بکس،ص75

(۹) مجید امجد، کلیات مجید امجد،ص83

(۱۰) محمد افتخار شفیع، پروفیسر،'مجید امجد کا تصور تنہائی' (مضمون)،مشمولہ نمود حرف،ص156

(۱۱) مجید امجد، کلیات مجید امجد،ص83

(۱۲) ایضاً،ص73

(۱۳) ایضاً،ص351

(۱۴) ایضاً،ص304

(۱۵) ایضاً،ص308

(۱۶) زکریا، خواجہ محمد، ڈاکٹر: (1977ء)'' مجید امجد کی شاعری''، مشمولہ ماہنامہ تخلیق لاہور،ص6

(۱۷) جابر علی ،سید، :(1985ء)اقبال ایک مطالعہ، لاہور، بزم اقبال،ص504

(۱۸) سکسینہ، رام بابو، :(1981ء) تاریخ ادب اردو (مرتب:تبسم کاشمیری)، لاہور، علمی کتب خانہ،ص247

(۱۹) نثار ترابی، ڈاکٹر:(2014ء)''مجید امجد۔۔ایک مصور''،(مضمون)، بازیافت،(مجید امجد نمبر)،لاہور، پنجاب یونیورسٹی،ص286

(۲۰) مجید امجد: کلیات مجید امجد،ص276

(۲۱) انور سدید، ڈاکٹر:(1998ء)اردو ادب کی مختصر تاریخ، طبع سوم، لاہور، عزیز بک ڈپو،ص474

(۲۲) مجید امجد:'' کلیات مجید امجد''،ص276

(۲۳) اقبال، علامہ محمد:(1994ء) کلیات اقبال(اردو)، لاہور، بزم اقبال،ص 53

(۲۴) عبدالشکور احسن، ڈاکٹر: (1977ء) ''اقبال اور فطرت'' (مضمون)، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ص451-457

(۲۵) مجید امجد، کلیات مجید امجد، ص98

(۲۶) ایضاً، ص529

(۲۷) ایضاً، ص148

(۲۸) ایضاً، ص235

(۲۹) ایضاً، ص333

(۳۰) ایضاً، ص627

(۳۱) ایضاً، ص314

(۳۲) بلراج کومل، ''مجید امجد۔ایک مطالعہ''، اوراق جدید نظم نمبر، ص364

(۳۳) مجید امجد، کلیات مجید امجد، ص59

(۳۴) ایضاً، ص155

(۳۵) احمد ندیم قاسمی، مجید امجد میری نظر میں، ''مٹی کا سمندر''، ضیا ساجد، ص330

(۳۶) مجید امجد، کلیات مجید امجد، ص150

(۳۷) قیوم صبا: (1975ء)، ''آئینوں کا سمندر''، مشمولہ ساہیوال، ص189

(38) William Blake:(1979) *Nature Poems and Others*, London, Oxford University Press,"Leisure", P.93

(۳۹) مجید امجد، کلیات مجید امجد، ص342

(۴۰) ایضاً، ص383

(۴۱) زکریا، خواجہ محمد، ڈاکٹر: (2014ء) '' شاعر حیات و کائنات'' مشمولہ بازیافت، لاہور، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ص51